ڈاکٹر شگفتہ فردوس
اسسٹنٹ پروفیسر/ ڈائریکٹر اسٹوڈنٹ افیئرز
جی سی ویمن یونی ورسٹی، سیالکوٹ

اردو نثر پر سرسیّد کی علمی و ادبی مساعی کے اثرات

ABSTRACT

Impact of Sir Syed's Efforts on Urdu Prose: Intellectual and literary aspects
By Dr. Shagufta Firdous, Asst. Prof./ Director Student Affairs, G. C. Women University, Sialkot.

In Perspective of 19th century's educational, scientific and especially political revolution, distinguished. Sir Syed Ahmad Khan adopted pragmatic approach towards the problems and well-being of Muslim community. He devoted his efforts for the development and awareness of his nation. He realized that only through western education Muslims would be able to survive in this world. He launched his efforts to revive the spirit of Progress in Muslims of India. His educational strategies changed the fate of Muslims. In this perspective, his marvelous educational, philosophical, religious, social and literary efforts are unforgettable. He introduced precise clear and functional language and new writing style in Urdu Prose to fulfill the needs for the use of Urdu as.

This research paper studies efforts of Sir Syed and impact of his utilitarian views over his companions as well as whole next generation of writers in Urdu.

نابغۂ روزگار ہستیاں صدیوں تک نسلوں کی آبیاری کرتی ہیں۔ ایسی ہی ایک مہتمم بالشان ہستی سرسید احمد خاں کی بھی ہے جن کے فکر و عمل نے انیسویں صدی کے منظر نامے کو بدل کر رکھ دیا۔ سرسید کی شخصیت ایک مصلح، ماہر تعلیم، مفسر قرآن، ادیب، محقق، انشا پرداز، نقاد اور صحافت کے حوالے سے اس قدر توانائی کی حامل ہے کہ ان کے بنا اردو نثر کی تاریخ مکمل ہی نہیں ہو سکتی اور اگر ہم انھیں اپنے عہد کا بہترین نثار قرار دیں تو غلط نہ ہوگا۔ جن کی مساعی سے اس عہد کے متعدد ادبا نے کسبِ فیض کیا۔ انھوں نے اردو ادب کی ہر صنف کو نہ صرف اپنے عہد میں متاثر کیا بلکہ دو سو صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی علما ادبا ان کی فکر سے خوشہ چینی کر رہے ہیں۔ ان کی اس دیرپا اثر پذیر شخصیت اور علمی و ادبی صلاحیت کا جائزہ لیتے ہوئے آل احمد سرور رقمطراز ہیں:

ان کے افکار کا ہماری زندگی کے اتنے پہلوؤں پر اثر پڑا ہے کے ان سے ہماری

> گہری عقیدت فطری ہے پھر بھی ہمارے لیے ضروری ہے کے جہاں تک ممکن ہو سکے ان کے ذہنی ارتقا کو سمجھیں ان کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت اور مختلف النوع کارناموں کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ان کے افکار سے ہم اپنے دور کے مسائل کو سمجھنے میں کیا مدد لے سکتے ہیں۔(۱)

سر سید نے جس عہد میں آنکھ کھولی وہ سیاسی اضطراب و انتشار کا دور تھا خانہ جنگیوں میں مصروف اور عیش پرست مغل حکمرانوں کے زوال کی داستان لکھی جا رہی تھی برصغیر میں ان کی جگہ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے قدم اس سرزمین پر مستحکم کر چکی تھی جس نے ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد سلطنت مغلیہ کے آخری چراغ کو ہمیشہ کے لیے گل کر دیا، اب کے مسلمانوں کے پاس عظمت رفتہ کے حسین خوابوں کے سوا کچھ نہ تھا اس تہی دست و داماں کیفیت میں وہ انگریزوں کے عتاب کا بھی کھل کر نشانہ بنے علاوہ ازیں برصغیر سے باہر بھی مسلم ریاستیں مغلوب ہو رہی تھیں اور انگریزوں کا سیاسی اور تجارتی غلبہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا عیسائی مبلغین نے اپنے قلم کا رخ مسلمانوں کی مخالفت کی جانب موڑ دیا اور خوب زہر افشانی کی سر سید احمد خاں جیسی ذی فہم ہستی نے ان سب اعتراضات کے مدلل جوابات دیے۔ انھوں نے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی انتھک کوششیں کیں تا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اپنے دل سے نفرت کے جذبات کو نکال سکیں جس پر انھیں بہت سے اعتراضات کا سامنا بھی کرنا پڑا اس حوالے سے پروفیسر رشید احمد صدیقی کہتے ہیں:

> اس عناد کو دور کرنے میں سر سید کو بڑی جدوجہد کرنی پڑی اور اس کی وجہ سے وہ اپنے پرائے دونوں میں بدنام ہوئے۔(۲)

سر سید احمد خان کی فکر میں ہمہ گیریت پائی جاتی ہے۔ اسی پر ان کی مقصدیت کی منہاج قائم ہے۔ ان کی مقناطیسی شخصیت نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ان کی دور اندیشی اور زمانہ شناسی کا ہی جوہر تھا جس نے جدید علم کے ذریعے مسلمانوں کو ترقی کے اس دھارے میں لانے کی کوشش کی جس سے وہ بالخصوص ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد الگ ہو کر رہ گئے تھے اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مفاد پرست ہندو ہر میدان میں مسلمانوں سے آگے نکلنے کی سعی میں مصروف تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سر سید احمد خان نے معیاری اور مستند کتابوں کے ذریعے مصر، ہندستان اور چین کی تاریخ سے مسلمانوں کو روشناس کرایا تا کہ وہ آئینۂ ایام میں اپنی صورت گری کر سکیں اور ان اقوام کے عروج و زوال کی داستاں سے سبق سیکھ سکیں ان کا کہنا تھا کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے زمانے کے انداز کو سمجھا اور خود کو اس کے مطابق ڈھالا تھا اسی وجہ سے وہ عزت و حشمت سے نہال ہوئے۔ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم خود کو آنے والے دور کے مطابق ڈھالیں ورنہ نکبت ہمارا مقدر ہو گی۔ انھوں نے امت مسلمہ کے مسائل کے مستقل حل کے لیے بہت حکیمانہ روش اختیار کی اور انھیں علم و آگہی کے میدان کا شہسوار بنانے کے لیے اپنے شب و روز وقف کر دیے۔ وہ بخوبی آگاہ تھے کہ جدید علوم سے آشنا ہوئے بغیر مسلمانوں

کا سیاسی، سماجی اور اقتصادی مستقبل خطرے میں ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو ہر حال میں مغربی علوم وفنون کو اپنا کر ذلت کی ان گہرائیوں سے نکلنا ہوگا جیسے وہ اس دور میں اپنی تقدیر سمجھ بیٹھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی بصیرت کی بنا پر مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کو عہدِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی انتھک کوشش کی ان کی فکر و نظر اپنی صدی سے بہت آگے مسلمانوں کے تابناک مستقبل پر مرکوز تھی، جس کے حصول کی خاطر مسلمانوں کو نئے دور کے تقاضوں کو سمجھ کر اپنی اصلاح کرتے ہوئے جدید علوم سے آراستہ ہو کر اپنی اصلاح کی ضرورت تھی۔ اس حوالے سے سرسید کا کردار ہمیشہ قابلِ ستائش رہے گا۔ ان کی اس بصیرت کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی رقمطراز ہیں:

> وہ دورِ جدید کے پہلے مسلمان تھے جس نے آنے والے زمانے کے ایجابی مزاج کا عکس اپنے آئینہ ادراک میں دیکھ لیا تھا اور اپنی ساری جہد وسعی کا رخ ہندوستان کی فلاح و بہبود، اسلام کی نئی تفسیر و تعبیر اور ایشیا کے ''نفس ہائے رمیدہ'' کی بازیافت کی طرف موڑ دیا تھا۔(۳)

سرسید احمد خان کی ان کوششوں کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کی پرورش علمی و ادبی فضا میں ہوئی جس میں ان کے نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خان بہادر مصلح جنگ، بڑے صاحب علم وفضل والی شخصیت کے حامل ماہر ریاضی تھے۔ انھیں مفتی صدرالدین آزردہ، مرزا غالب اور امام بخش صہبائی جیسے صاحبِ علم اساتذہ کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع بھی ملا اور دلی کی فضا نے ان کا لسانی شعور سنوارنے اور نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سرسید احمد خان کی اولین علمی و ادبی زندگی کا آغاز بائیس سال کی عمر ۱۸۴۰ء میں رسالہ ''جام جم'' سے ہوا اس سے ان کی تاریخ نویسی میں دلچسپی اور تاریخی شعور کا پتا چلتا ہے۔ رسالہ میں جدول کا طریقہ متعارف کرواتے ہوئے ۱۷ خانوں میں امیر تیمور آریائی خاندان ۱۳۹۸ء سے لے کر آخری مغل بادشاہ بہادر ظفر ۱۸۳۷ء کے سال جلوس تک کے حالات کو منقسم کر کے تحریر کیا گیا ہے اس حوالے سے اس کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ثریا حسین لکھتی ہیں:

> جامِ جم پیش رو ثابت ہوا کیونکہ اس کے بعد اسی نہج پر بہت سی جدولیں تیار کی گئیں جیسے 'مرقعِ سلاطین' (حصہ اوّل) آثار المتاخرین مرتبہ عبدالغفور ۱۸۷۵ء۔(۴)

سرسید اپنے اسلاف کے کارناموں کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے اور ان سے بے خبر ہونا عزت کے منافی خیال کرتے تھے اس لیے کہتے ہیں:

> کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھو دے۔(۵)

سرسید احمد خاں نے ۱۸۴۷ء میں ۵۸۳ صفحات اور ۱۳۰ تصاویر پر مشتمل کتاب ''آثار الصنادید'' لکھی جو ڈیڑھ

سال کے عرصہ میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے جس کی تقریظ مرزا غالب نے لکھی۔ ''آثار الصنادید'' میں اردو کی مختصر تاریخ کے علاوہ دہلی کی دو سو کے قریب پرانی عمارات کا عمیق و دقیق تحقیقاتی جائزہ شامل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے تحقیق کے ہر ممکنہ ذریعے کو بروئے کار لانے کی سعی کی تا کہ درست معلومات قاری تک پہنچائی جا سکے۔ ان کی ان تحقیقاتی کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے جمیل یوسف لکھتے ہیں:

> دراصل ان کی فطرت میں تحقیق و جستجو اور مشکل پسندی اور مہم جوئی کا پیدائشی جذبہ تھا جو انھیں قدیم تاریخی عمارات کی طرف کشاں کشاں لے گیا۔ انھوں نے اس ذوق و شوق اور انہماک سے عمارات پر تحقیق کی کہ آج تک ان سے پہلے کسی نے اس موضوع پر اتنی محنت کی نہ ان کے بعد ہی کسی نے کوئی ایسی دستاویز مرتب کی جو اس موضوع پر ان کی کتاب آثار الصنادید کا مقابلہ کر سکے۔(۶)

سرسید احمد خان کی اس کتاب میں دہلی شہر کی بیرونی اور لال قلعہ کی عمارات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں شاہ جہاں آباد کی عمارات کے کتبوں، طول و عرض، ان کے معماروں، تعمیر کے مقاصد، شکست و ریخت، ترامیم و اضافے، نقشوں اور تعمیراتی فنی باریکیوں کو مفصل بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے ہم عصر مشاہیر دہلی، مشائخ، اطبا، قرا، شعرا، خطاطوں، مصوروں اور موسیقاروں کا ذکر بھی اس تصنیف میں کیا گیا ہے۔ تاریخ نویسی کے میدان میں سرسید نے اپنی شبانہ روز کاوشوں سے ایک مثالی کتاب تصنیف کر کے آنے والے تاریخ نویسوں کے لیے ایک بہترین مثال قائم کی۔ اس کتاب کے انگریزی ترجمے کو یورپ کے علمی حلقوں میں بے حد پذیرائی ملی اور سرسید کو اس کی بنا پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے ۴؍جولائی ۱۸۶۴ء کو باقاعدہ طور پر اپنا فیلوشپ کارڈ جاری کیا۔ درحقیقت سرسید احمد خان کی یہ کاوش تاریخ کے گمشدہ حوالوں کی بازیافت کی جانب ایک اہم قدم ہے۔ اس حوالے سے ثریا حسین رقمطراز ہیں:

> سید احمد خان نے مطالعہ آثار قدیمہ کے ذریعے سلطنتوں کے عروج و زوال کا جائزہ لیا۔ انھوں نے ایسے رسائل لکھوائے اور خود بھی لکھے جن سے تاریخ کے مخفی پہلو منکشف ہوئے۔ آگرہ اور دہلی کے کھنڈروں نے ان کے ذوقِ تاریخ کو نمایاں کیا۔(۷)

سرسید احمد خان کی اس کتاب کا اولین ایڈیشن دقیق زبان میں تھا۔ اس مرصع زبان کو سلیس میں بدل کر چھ سال بعد اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جس میں ترمیم و اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ عمارات کا حال زمانی ترتیب سے دے کر حوالہ جات و حواشی کا خصوصی التزام بھی کیا گیا۔ اس ایڈیشن میں میں تاریخی عمارات کے کتبوں کے چربے بھی شامل کیے گئے۔

سرسید کی ایک اور تاریخی کاوش ''سلسلۃ الملوک'' ہے جس میں سرسید نے شاہان سلف کے حالات کی تاریخ و فہرست مرتب کی۔ اس کتاب میں پانچ ہزار سال قبل کے راجاؤں اور بادشاہوں کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے

۱۸۰۳ء سے مغلوں کے حال کو ضمنی طور پر بیان کرنے کے ساتھ اصل حکمران شاہ برطانیہ سوم کو قرار دیا جس سے اس دور میں ان کی بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تحقیقی حوالے سے ''تصحیح آئینِ اکبری'' سر سید احمد خان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ سر سید احمد خان نے تحقیقاتی اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دستیاب نسخوں کا تقابل کر کے نہ صرف صحیح تر نسخہ تیار کیا بلکہ اسے با تصویر بھی بنایا۔ سر سید کا تعلق کیونکہ براہ راست دربار مغلیہ سے تھا اس لیے انھوں نے ''تصحیح آئین اکبری'' میں مغلیہ کلچر کی حقیقی عکاسی کرتے ہوئے آلاتِ حرب، ظروف، زیورات وغیرہ کی تصویر کشی کی ہے۔ ''تاریخِ فیروز شاہی'' کے ذریعے سے بھی انھوں نے مسلم تہذیبی اقدار کی اصلاح کی کاوش کو جاری رکھا۔ ان کی تاریخ نویسی کی خدمات کو آج بھی مستند مانا جاتا ہے۔

اردو صحافت کے میدان میں بھی سر سید احمد خاں کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ''سید الاخبار'' سے کیا۔ اس اخبار کا مطبع خانہ ۱۸۴۱ء میں ان کے بڑے بھائی نے قائم کیا ان کے انتقال کے بعد سر سید احمد خان نے مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا جو ۱۸۴۹ء میں مالی مشکلات کے باعث اس مطبع کے بند ہونے پر ختم ہوا۔ ۱۸۶۶ء میں سر سید احمد خان نے ''علی گڑھ انسی ٹیوٹ گزٹ'' جاری کیا جس سے صحافتی میدان میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ اس میں چھپنے والے مضامین میں حالات حاضرہ پر تبصروں کے علاوہ صحافتی فرائض کا شعور بیدار کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ اس حوالے سے سر سید احمد خان اپنے ایک مضمون ''اخبار نویسوں کی آزادی کیا چیز ہے'' میں لکھتے ہیں:

> آزادی ہمارے نزدیک اس بات کا نام ہے کہ کسی اخبار نویس کی طبیعت صاف گوئی اور راست بازی میں کسی کی غلام اور تابعدار نہ ہو۔(۸)

''علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ'' کے ذریعے سر سید احمد خان اہلِ ہند کے لیے اعلیٰ پائے کے مضامین تخلیق و ترجمہ کروانا چاہتے تھے تاکہ اہلِ ہند اس سے کسبِ فیض کر سکیں۔ اس حوالے سے وہ اپنے ایک مضمون میں انگریزی ادب سے ترجمہ ہونے والے مضامین کی افادیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> انگریزی زبان سے ترجمہ ہو کر نفیس اور عمدہ مضمون جو اب لکھے جاویں گے اور اخباروں سے ایسے مضمونوں کے ترجمے چھاپے جاویں گے جو ہندوستانیوں، بلکہ کل انسانوں کے لیے مفید بکار آمد ہوں گے اور جن سے ہندوستان کے لوگ اور کسی طرح واقف نہیں ہو سکتے۔(۹)

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ دوزبانوں میں شائع ہوتا تھا جس میں باصلاحیت مترجمین کو جگہ دی گئی۔ سر سید اخبار کے لیے اداریے بھی خود لکھتے رہے۔ ان کے موضوعات میں تہذیبِ نفس، انسانی ہمدردی، شائستگی کیا چیز ہے، تعصب، مروّت، کفایت شعاری نمایاں ہے۔ اجتماعی سطح پر انھوں نے حقوقِ نسواں کو بھی اپنے مضامین میں اہمیت دی۔

۲۴/دسمبر ۱۸۷۰ء کو یورپ سے واپسی پر انھوں نے ''تہذیب الا اخلاق'' جاری کیا جس کا مقصد قوم کی معاشرتی زندگی کو بہتر بنانا تھا انھوں نے مشہور انگریزی اخبارات ''ٹیٹلر'' اور ''اسپیکٹیٹر'' کو مثال بنا کر اس طرح کا رسالہ جاری کیا جس میں رسم و رواج، آزادی رائے، اخلاق، ریا کاری، عورتوں کے حقوق، تربیت اطفال اور مہذب قوموں کہ پیروی جیسے مضامین لکھے جس کا مقصد معاشرتی اصلاح تھا۔ سرسید نے اعلیٰ درجے کے مضامین لکھ کر اپنے بعد آنے والوں کے لیے ایک بہترین مثال قائم کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی اِن کاوشوں کی صدائے بازگشت نہ صرف ان کے عہد میں شائع ہونے والے علمی و ادبی رسائل میں دکھائی دیتی ہے بلکہ انھوں نے بعد میں آنے والے بہت سے لکھنے والوں کو بھی متاثر کیا۔ صحافت کے میدان میں سرسید کی اولیت واثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> اردو جرنلزم کی ابتداء بھی سرسید سے ہوتی ہے انھوں نے آزادی رائے کے اعلان سے اپنی صحافتی مصروفیتوں کا آغاز کیا تھا۔ الہلال، البلاغ، مخزن، زمیندار، ہمدرد، سر سید کی اس ضمن کی کوششوں کی صدائے بازگشت ہے۔[۱۰]

سرسید اپنے مضامین کے ذریعے اہلِ ہند کو جدید مغربی نظریات سے روشناس کرانا چاہتے تھے تا کہ مسلم فکر و نظر میں وسعت و شگفتگی پیدا ہو سکے اور وہ اپنی خودی کو پہچان کر اپنی انفرادیت کے تحفظ کے لیے عملی طور پر کوشش کر سکیں۔ اس لیے ان کے مضامین نے اردو ادب میں نشاۃ الثانیہ کا قردار ادا کیا اور مسلمانوں کے فکری احیا کے ذریعے انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

> تہذیب الاخلاق اپنی قسم کا پہلا واحد علمی و ادبی رسالہ تھا جس سے اردو علم و ادب کی نشاۃ الثانیہ کی ابتدا ہوئی۔ اس نے مغربی افکار کو اردو دنیا سے روشناس کرایا۔[۱۱]

رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' نے مسلمانوں کی قومی، ذہنی، ادبی اور جذباتی تربیت کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین نے اپنے قارئین کی بصیرت اور علم و آگہی میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ اعلیٰ ترین مضامین تخلیق کر کے زبان کی وسعت میں بے پایاں اضافہ بھی کر دیا۔ اگرچہ اس سے قبل اردو زبان میں ادب تخلیق کیا جا رہا تھا لیکن سرسید احمد خان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کو ہر طرح کے مضامین کے اظہار کا وسیلہ بنا دیا۔ انھوں نے اردو زبان کو سائنس و ٹیکنالوجی کے اظہار کی زبان ہی نہیں بنایا بلکہ اس میں اپنے شاعرانہ طرزِ ادا کے ذریعے حُسن بھی پیدا کیا۔ اس رسالے کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے اسے اردو ادب کی اک نئی تاریخ قرار دیا ہے جس سے اس نئے دور کے بلند معیارات تک رسائی ممکن ہو سکی۔ وہ اس حوالے سے کہتے ہیں:

> اغلب خیال یہ ہے کہ عوام کے ذہنی رجحانات پر جتنے ہمہ گیر اثرات ''تہذیب الاخلاق'' نے چھوڑے ہیں۔ برصغیر کے کسی اور رسالے نے نہیں چھوڑے اس رسالے کے اجرا

سے موجودہ اردو ادب کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو نے اس رسالے کی بدولت اتنا فروغ پایا کہ دقیق سے دقیق مطالب کا اظہار اس زبان میں ہونے لگا اس دور کا کوئی مسلمان ادیب ایسا نہ تھا جو تہذیب الاخلاق کے اثر سے متاثر نہ ہوا ہو۔ دورِ جدید کے بلند معیار نے اس خوانِ نعمت سے لقمے چنے اور اسی کے حلقہ اثر و نفوذ سے نقد و بصر کی نئی قدریں اور فکر و نظر کے لیے زاویے متعین ہوئے۔[۱۲]

سر سید کی نثر مقصدیت اور مدعا نویسی سے آمیز ہو کر زبان کو نکھارنے میں معاون ثابت ہوئی۔ انھوں نے ثقیل ادبی انداز کو ترک کر کے زبان کو سادگی و سلاست کا مظہر بنایا، نئی اصطلاحات متعارف کروائیں، زبان کو رنگینی سے آزاد کرا کے حقیقت کا عکاس بنایا۔ انھوں نے زبان و ادب کو قاری کے دل تک رسائی تک ذریعہ قرار دیتے ہوئے اسے تصنع سے آزاد کر کے حقیقت شناسی کی جانب متوجہ کیا تا کہ قاری براہِ راست لکھنے والے کے مقصد سے آگہی حاصل کر سکے۔ سر سید احمد خان ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کے قائل تھے اور علم و ادب کو انسانی فلاح و مقصدیت کے پس منظر میں دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ اس حوالے سے انھیں اپنی کاوشوں کا بخوبی اندازہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ دیگر مصنّفین بھی اسی طرزِ تحریر کو اپنا کر سلاست و روانی کو اپنی تحریروں میں جگہ دیں تا کہ قاری بآسانی مفہوم تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس حوالے سے اپنے مضامین اور رسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے کوشش کی، مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زباں نے یاری دی، الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی، رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور مضامین خیالی سے بھری ہوتی ہے اور اس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا، جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل پر پڑے، تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔[۱۳]

سر سید نے اپنے اس طرزِ تحریر سے اردو نثر کو اک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا جس سے وہ ابھی تک محروم تھی۔ ان کے اردو ادب پر اثرات بہت دور رس ہیں۔ انھوں نے اپنے ہم فکر معاصرین کی ایک ایسی جماعت کی تربیت کی جس نے اپنے بعد میں آنے والی نسلوں کو بھی ایک نئی سمت عطا کی۔ انھوں نے اردو زبان کی اصلاح کی کوششوں کو جاری رکھتے ہوئے اسے ایک

اعلیٰ معیار عطا کیا۔ سرسید احمد خان کی نثر نگاری کو سراہتے ہوئے احسن فاروقی رقمطراز ہیں:

> سرسید کی نثر ایک دائمی تعمیر کی سنگِ بنیاد ہے۔ اردو نثر کا انھوں نے ایسا ماڈل پیش کیا جو ہمیشہ ایک عینی معیار کی طرح ہر اردو نثر نگار کے سامنے رہے گا۔(۱۴)

سرسید نے اپنے تحریروں کو قومی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے جس قدر بھی اپنے اندر طاقت محسوس کی اسے اپنی قوم کے لیے وقف کر دیا۔ سرسید کے مضامین میں بہت وسعت پائی جاتی ہے۔ کہیں وہ منطق کی بات کرتے ہیں تو کہیں اخلاقی نقطۂ نظر سے معاشرتی اصلاحی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ہندوستان کے مسلمانوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں اور کہیں ان کے ہاں یہ اخلاقی تصوّر مصوّری کی حدوں کو چھوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ غالب سے اردو ادب میں شخصی نثر کا آغاز ہوا لیکن حقیقتاً اردو ادب کو زندگی کے حقائق سے روشناس کرانے میں سرسید کو اوّلیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آل احمد سرور نے نہ صرف انھیں جدید نثر کا بانی قرار دیا ہے بلکہ مختلف اصنافِ ادب پر ان کی دسترس اور کی طرزِ تحریر کی دلکشی کو بھی سراہا ہے۔

> سرسید اردو نثر کے بہت بڑے معمار ہیں بلکہ جدید نثر کے بانی کہے جا سکتے ہیں۔ خود ان کی تصانیف میں ادب، تحقیق، علم کلام، صحافت، انشا پردازی سبھی کے نمونے ملتے ہیں۔ وہ نثر کی روح کو سمجھتے ہیں اور اس کی تعمیری حسن کو جانتے ہیں وہ معلومات عطا کرتے ہیں اور ذہن کو جلا دیتے ہیں انھیں ان معلومات کو خوشگوار ڈھنگ سے پیش کرنا بھی آتا ہے۔(۱۵)

سرسید نے اردو نثر کو نئی زندگی عطا کی اور اسے تاریخ، اخلاق، سیاست اور ادب سے آمیز کرنے کے ساتھ ساتھ اردو گرامر کی اصلاح کی کوشش کرتے ہوئے اس کی سادگی وصفائی پر بھی توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد میں اردو ادب جدید علوم نہ صرف روشناس ہوا بلکہ اس نے اپنی انفرادیت بھی قائم کی۔ یہ سب سرسید ہی کا فیضِ عام ہے کہ آج اردو ادب تاریخ، مذہب، سیاست، اخلاق، صحافت، نثری وشعری نقد ونظر میں اپنی انفرادیت قائم کر چکا ہے اور ان کے تربیت یافتہ اہلِ قلم اپنی انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔ سرسید کے اس بارے احساں کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق فرماتے ہیں:

> ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمران ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بارِ احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامنِ تربیت میں پلے ہیں، بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے، بعض نے مدعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیونکر رہ سکتے تھے۔(۱۶)

سرسید احمد خان نے روایت شکن ادیب تھے۔ انھوں نے تقلید کی راہ سے ہٹ کر ایسے مکتب کی بنیا استوار کی جس

میں نیچر، مادیت پرستی جدید تہذیب و معاشرت، حقائق نگاری اور اجتماعیت کو اولیت حاصل تھی۔ وہ ایک رجحان ساز نثر نگار تھے۔ انھوں نے اردو ادب کو ایک نئی طرزِ فکر عطا کی۔ جس سے ان کا پورا عہد متاثر ہوا۔ ان کا اصل مطمح نظر قوم میں عزتِ نفس پیدا کرنا تھا۔ وہ قومی ہمدردی کی روح اُجاگر کر کے انھیں تہذیب و شائستگی کی تربیت دینا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے ان کی سیاسی فکر نے بہت معاونت کی اور اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب بھی رہے۔

سیاسی حوالے سے امتِ مسلمہ کے لیے کی جانے والی سرسید کی کوششوں سے انکار ناممکن ہے۔ یہی وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے تشخص کی حفاظت اور ان کی انفرادیت کے لیے قوم کا لفظ استعمال کیا۔ اس حوالے سے ان کی کوششوں کو ان کی علمی و ادبی کاوشوں سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ کیوں کہ انھوں نے اپنے مضامین کو اپنے خیالات کا بہترین مظہر بنا دیا اور اپنے خون جگر سے امت مسلمہ کے چمن کی سیاسی، علمی و ادبی، ثقافتی، سماجی اور مذہبی سطح پر آبیاری کرنے کی کاوشوں کو جاری رکھا۔ انھوں نے اپنی قوم کے مستقبل کا رخ زوال سے عروج کی جانب موڑنے کی سعی کی ان کے اس خوا ب اور اس کی تعبیر کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر سید عابد حسین رقمطراز ہیں:

> انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب عام طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی، معاشرتی اور اخلاقی پستی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور زندگی کا دھارا سکڑتا جاتا تھا۔ یکا یک تہہ اندر سے نئی لہریں ابھرنے لگیں جنھوں نے اسے بڑھا کر اچھا خاصا دریا بنا دیا۔ مسلمانوں میں زندگی کی نئی رو سرسید اور ان کے مٹھی بھر ساتھیوں کی اپج سے اٹھی اور جس قدر پھیل سکتی تھی پھیلی۔(۱۷)

سرسید نے اردو ادب کو عام فہم اسلوب عطا کر کے اسے موضوعاتی طور پر اس قدر وسعت عطا کی کہ اس میں تشنگی کا کوئی پہلو باقی نہ رہا۔ یہ انھی کا کمال ہے کہ اردو ادب اقدار عالیہ کا ترجمان بنا۔ انھوں نے اپنی تحریر و تقریر کو اجتماعی شعور کی بیداری کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے انشا پردازی کو بامِ عروج پر پہنچایا یہاں تک کہ ان کی مثال ملنا ناممکن ہے۔ شبلی نعمانی نے سرسید احمد خان کو انشا پردازی کا مجدد و امام کہا ہے۔ جنھوں نے اخلاقی، فلسفیانہ اور ادبی مضامین لکھ کر اپنے معاصرین کو اہلِ مغرب کے افکار سے روشناس کرایا۔ ان کی با کمال تخلیقی شخصیت کے اثرات ان کے معاصرین کی تحریروں میں بے حد نمایاں ہیں۔ انھوں نے اپنی فکر سے ایک ایسی تحریک کا آغاز کیا جس نے علمی، ادبی، سماجی، مذہبی اور فلسفیانہ کاوشوں کے ذریعے سے ایک صبح روشن کی جانب اپنی قوم کی رہنمائی کی اور ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں نے ایک ایسی فضا پیدا کی جس میں رہ کر نہ صرف انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھا بلکہ ان کے معاصرین نے بھی خوب استفادہ کیا اور سرسید کی صحبت نے ان کے معاصرین کو صفِ اوّل کا ادیب بنا دیا۔ اس حوالے سے آل احمد سرور کہتے ہیں:

> ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ایک معلم اور دبستان تھے جس نے ایک فوج

کی فوج کو ایک لگن، جذبہ اور ایک شرر آرزو دے دیا۔ (۱۸)

سرسید کی تمام تر علمی مساعی کا اصل مقصد نوجوانوں میں جوش و جذبہ بیدار کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں جوش، طمانیت، سائنسی علوم سے استفادہ کرنے کی آرزو پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی فکر کو سادگی سے بیان کرنے پر زور دیتے تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کے تمام بڑے ادبا کو متاثر کیا جس کی اوّلین مثال شبلی نعمانی ہیں جنھوں نے سرسید کے زیرِ سایہ تربیت پائی اور بعد ازاں ندوۃ العلما اور دارالمصنّفین میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سب سرسید کے رہینِ منّت ہے کیوں کہ اگر علی گڑھ کی تربیت نہ ہوتی تو ان اداروں کی انفرادیت بھی قائم نہ ہوتی۔

سرسید نے اردو ادب کو جدت پسندی سے روشناس کرایا اور تقابلی مطالعوں کی طرف توجہ دی۔ انھی کے تتبع میں شبلی نعمانی نے ''موازنۂ انیس و دبیر'' لکھی۔ سرسید کی اثر پذیری کے حوالے سے ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب لکھتے ہیں:

> اردو میں تقابلی مطالعے کا آغاز بھی سرسید کی ''تبیین الکلام فی تفسیر التورات والانجیل علٰی ملۃ الاسلام'' (حصہ اوّل مطبوعہ ۱۸۶۲ء حصہ دوم مطبوعہ ۱۸۶۵ء پرائیوٹ پریس غازی پور) سے ہی ہوتا ہے۔ (۱۹)

سرسید احمد خان مذہب کو عقلی حوالے سے دیکھنے کے آرزومند تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے فرسودہ رسوم و رواج کی پیروی ترک کر کے مذہب کو بھی عقلی بنیادوں پر پرکھنے کی کوشش کی، جس کی انھیں مخالفتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ مذہبی حوالے سے ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''خطباتِ احمدیہ'' ہے۔ جس میں انھوں نے ولیم میور کے لگائے گئے الزامات کا بھرپور جواب دیا اور اسلام کے دفاع کی خاطر اپنی تمام تر علمی، ادبی اور معاشی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بہترین مسلمان ہونے کا ثبوت دیا۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی سرسید احمد خاں کے طرزِ تحریر میں لکھتے ہیں:

> سرسید واقعتاً جدید ذہن کے مالک تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ اصل اسلام میں بین فرق پیدا ہو چکا ہے اور یہی وہ فرق ہے جو مسلمانوں کی ترقی میں مانع ہے اور ان کے زوال کا خاص سبب ہے۔ (۲۰)

سرسید اردو شاعری کو تصنع، مبالغہ، خوشامد اور ابتذال سے پاک کر کے حقیقت نگاری کی راہ پر گامزن کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے زبان کی وسعت میں اضافہ کرنے کے لیے نئے الفاظ کو جگہ دی۔ علمی مباحث میں علمی و ادبی زبان کا استعمال عام کیا علمی تلمیحات و اصطلاحات میں کمی کے باوجود اپنا مدعا بطریق احسن بیان اور زبان کی روانی میں اپنا کردار ادا کیا۔ اردو شاعری میں ان کی اصلاحی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے شاعروں کو نئے خیالات و جذبات کے اظہار کی جانب راغب کیا اور کہا کہ ہمیں نظم میں غیر شائستہ و مبتذل الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہوئے زندگی کے حقائق کو بیان کرنا چاہیے۔ انھوں نے شاعری کو اصلیت، نیچر اور سادگی سے آمیز کر کے اسے نئی زندگی عطا کرنے کی تمنا ظاہر کی۔ یہ وجہ

ہے کہ ''انجمن پنجاب'' کے قیام پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے سرسید کہتے ہیں:

> نہایت خوشی کا مقام ہے کہ زمانے نے اس کو بھی ریفارم کیا اور اہلِ پنجاب اور اس نقص کو رفع کرنے پر متوجہ ہوئے۔ اردو زبان کے علم کی تاریخ میں ۱۸۷۴ء کا دن جب لاہور میں نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ قائم ہوا ہمیشہ یادگار رہے گا۔(۲۱)

سرسید تنقیدی شعور بھی رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم بھی خیالیہ، عشقیہ، بیانیہ اور نیچرل مضامین کے فرق کو سمجھ لیں تو ہماری زبان میں بھی ملٹن و شیکسپیئر جیسے نامور شعراء پیدا ہو سکتے ہیں۔ انھیں اس بات کا قوی یقین تھا کہ اگر ہم اپنی شاعری کو سادگی، عقلیت اور حقیقت پسندی کی جانب لائیں تو اس سے قوم کی اصلاح کا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے دستِ راست الطاف حسین حالی کو ''مدوجذرِ اسلام'' جیسی شہرا آفاق نظم لکھنے کی جانب آمادہ کیا۔ وہ ترقی پسندانہ فکر رکھنے والی شخصیت تھے۔ جس کی وجہ سے ان کا پورا عہد متاثر ہوا۔ انھوں نے غزل کی نسبت آزاد نظم کو زیادہ پسند کیا تا کہ خیالات کی ترسیل میں حائل تمام تر رکاوٹوں کو دُور کیا جا سکے۔

سرسید کے ہاں نیا پن اور حقیقت شناسی کے لیے تحقیق کا طرزِ عمل نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے رفقا کی تربیت میں بھی ہمیں سرسید کا سائنسی طرزِ فکر دکھائی دیتا ہے اور انھوں نے اپنی انھی کاوشوں سے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا اور اردو ادب کو اک نیا رنگ دیا۔ سرسید کے رفقا پر ان کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

> ان کے مکتب کے فیض یافتہ لوگ اور ان کے ادب اثر پذیر تمام لوگ تقلیدی کم اور تحقیقی زیادہ ثابت ہوئے۔(۲۲)

سرسید احمد خاں فنِ خطابت نگاری کے موجد بھی ہیں۔ انھوں نے تحریر و تقریر دونوں صورتوں میں زبان اردو کے امکانات کو وسیع تر کیا ہے اور یہ ان کا امتیاز بھی ہے کہ انگریزی زبان پر دسترس نہ رکھنے کے باوجود انھوں خطابت کے بہترین مثالی نمونے پیش کر کے اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ علی گڑھ بہت بڑے مقررین کے لیے خطابت کی پہلی درس گاہ تھی جس نے بڑے بڑے علما کی بہترین تربیت کا انتظام کیا۔ یہ وجہ ہے کہ ابوالکلام آزاد سرسید کے اس احسان کو تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> اس دور کے تمام مشہور مقرروں کو اسی حلقہ نے پیدا کیا اور اگر پیدا نہیں کیا تھا تو ان کے لیے پلیٹ فارم یہیں مہیا کیا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے سارے اردو مقرر سرسید اسکول کے تربیت یافتہ تھے۔(۲۳)

سرسید کی علمی و ادبی مساعی کا فیض عام تھا کہ کہ اردو کی کہنگی اور فرسودگی تازگی میں بدل گئی ادب مقصدیت و ہمہ گیریت کی صفات سے متعارف ہوا۔ اردو ادب میں وہ وسعت پیدا ہوگئی کہ کوئی اس کی تنگ دامانی پر شکوہ کناں نہ ہوسکتا

تھا۔ ان کے رفقائے کار نے ان کے خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے اپنے خاص میدانِ فکر، اصناف اور جہات میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے سرسید کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنا قردار ادا کیا۔ حالی، شبلی، نذیر احمد، چراغ علی، ذکاء اللہ، نواب محسن الملک نے سرسید سے براہ راست اثرات قبول کیے علاوہ ازیں علی گڑھ سے وابستہ دیگر ادبا میں مولوی عبدالحق، مولانا وحیدالدین سلیم، نواب عماد الملک، مولانا عبدالحلیم شرر، نواب صدر یار جنگ، مولانا ظفر علی خاں، سجاد حیدر یلدرم، حسرت موہانی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، مولانا عبدالماجد دریابادی، حکیم احمد شجاع، ذاکر حسین وغیرہ بھی نہ صرف سرسید کے افکار سے متاثر تھے بلکہ انھوں نے حتی الوسع سرسید علی گڑھ سے تربیت پا کر سرسید کے افکار و نظریات کی ترویج کا کام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں جدید ادب کا ''پدرِ بزرگوار'' کہا گیا ہے۔

آل احمد سرور نے سرسید کے کام کو بہترین نثری نمونہ قرار دیا ہے اور ان کے ہاں بڑے فکری رجحانات و نظریات کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں نئے ادب کا نقیب و منادتسلیم کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید نے اپنی تقریر و تحریر کے ذریعے سے ایک محدود سیاسی یا تعلیمی تحریک کو جنم نہیں دیا بلکہ ایک جامع ذہنی تحریک کو اُجاگر کیا جس میں علم و ادب کے ساتھ تہذیب و معاشرت کا رُخ بھی موڑ دیا۔ یہ سرسید کا ہی فیضِ عام کہ ان کے تربیت یافتہ رفقا اپنے اپنے فن میں یگانہ و یکتا ہوئے۔ ان کی تحریروں میں حقائق و مقصدیت نے جگہ پا کر زندگی کے حقیقی رنگ کو اُجاگر کیا۔ کہیں پر انھوں نے حالی کو امت مسلمہ کی حالتِ زار کا شعری اظہار کرنے پر آمادہ کیا تو کہیں شبلی نعمانی کی سوانح و سیرت نگاری کے ذریعے عظمت و سطوت اسلامیہ کے بیان کو مسلمانوں کے لیے راہبری کا ذریعہ بنایا۔ نذیر احمد اور شرر کے ناولوں کے ذریعے فنِ ناول نگاری کو متعارف کروایا اور کہیں تہذیب الاخلاق کے ذریعے مقالہ نگاری کے فن کو عروج پر پہنچایا۔ انھوں نے نہ صرف اپنے معاصرین کو اپنا ہم خیال بنایا بلکہ علی گڑھ کے تربیت یافتہ مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علی خان، سجاد حیدر یلدرم، مولوی عنایت اللہ، مولانا حسرت موہانی، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریابادی، خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر ذاکر حسین حتیٰ کہ علامہ اقبال جیسی شخصیت کو متاثر کر کے اردو اب کی ہر صنف کو ایک نئی نہج عطا کی۔ اس لیے یہ کہنا بلکہ درست ہے کہ:

> سرسید کی یہ رہنمائی نہ ہوتی تو حالی کی عظیم الشان کوشش بار آور نہ ہوسکتیں۔ علامہ شبلی، مولوی شبلی ہی رہتے، نذیر احمد عربی کے ایک زبردست عالم ہی کہلاتے، اردو ادب میں ان کا یہ مرتبہ نہ ہوتا وہ نئی نسل وجود میں نہ آتی جس نے اقبال کی شاعری، سجاد حیدر کی نثر، عبدالقادر کے مضامین اور ظفر علی خاں، محمد علی، طفیل احمد کی صحافت کے ذریعے سے ایک نئی مشرقیت کا چراغ روشن کیا۔(۴۴)

سرسید نے قوم میں ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی، انھیں سماجی مفاد کی جانب راغب کر کے ادب میں ابلاغ پر زور دیا۔ ان ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ اردو زبان داستان، تراجم، مرثیہ اور مثنوی سے آزاد ہوگئی۔ اس میں اتنی وسعت و

ہمہ گیریت پیدا ہوئی کہ ادب میں اظہار مدعا، عقلیت اور بیان حقائق کو جگہ ملی۔ اور اردو ادب جمود سے حرکت، تنگ نظری سے وسعت کی جانب راغب ہوا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

> انھوں نے نہ صرف اردو زبان کی حفاظت کی بلکہ اسے غیر معمولی ترقی دے کر اردو ادب کی نشوونما و ارتقا میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نثرِ اردو کو اجتماعی مقاصد سے روشناس کیا اور اس کو سہل اور سلیس بنا کر عام اجتماعی زندگی کا ترجمان اور علمی مطالب کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔(۲۵)

سرسید کی تحریریں استدلال اور توجیہہ کی بہترین مثال ہیں۔ انھوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر اردو ادب کے اُفق کو اک نئی جگمگاہٹ عطا کی۔ یہ سب انھی کا فیضان ہے کہ آج اردو زبان و ادب سوانح نگاری، انشا پردازی، شاعری، نثر، خطابت، صحافت اور سیرت نگاری میں اپنی انفرادی شان رکھتا ہے۔ ان کے پیروکاروں نے آپ کے نقشِ قدم پر چل کر اردو زبان کی وسعت کے امکانات کو مزید وسعت بھی دی ہے اور آج بھی ان کی فکر و نظر سے کسبِ فیض کیا جا رہا ہے جو ان کا اردو ادب پر بہت احسان ہے۔

حواشی

(۱) آل احمد سرور، سرسید اور مغرب کے تہذیبی و مغربی اثرات مشمولہ علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز، مرتبہ: نسیم قریشی، (علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۶۰ء)، ص ا-ب

(۲) پروفیسر رشید احمد صدیقی، سرسید اور علی گڑھ، ایضاً، ص ۴

(۳) پروفیسر خلیق احمد نظامی، سر سید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے، نئی دہلی: انجمن ترقیِ اردو (ہند)، ۱۹۹۳ء، ص ۲۸

(۴) ثریا حسین، سرسید احمد اور ان کا عہد، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۳ء، ص ۲۱۰

(۵) منشی محمد سراج الدین (مرتب)، سرسید احمد خان کے لیکچروں کا مجموعہ مع مختصر سوانح عمری، لاہور: کشمیری بازار، ۱۸۹۰ء، ص ۴۴

(۶) جمیل یوسف، پاکستانی ادب کے معمار سر سید احمد خان: شخصیت و فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص ۳۳

(۷) ثریا حسین، سرسید احمد اور ان کا عہد، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۳ء، ص ۲۱۰

(۸) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، جلد ۸، شمارہ نمبر ۳۳، علی گڑھ: ۸/اگست ۱۸۷۳ء، ص ۷

(۹) سرسید احمد خاں، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ، جلد ۱، شمارہ ۱، ۳۰/مارچ ۱۸۶۶ء، ص ۲

(۱۰) پروفیسر خلیق احمد نظامی، سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے ،نئی دلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۹۳ء،ص ۵۱
(۱۱) ڈاکٹر عقیلہ جاوید (مرتب)، اردو نثر کے اسالیب، (منتخب مضامین)، لاہور: بیکن ہاؤس، ۲۰۰۴ء)،ص ۵۵
(۱۲) ایضاً،ص ۴۵
(۱۳) آل احمد سرور، سرسید اور مغرب کے تہذیبی اثرات،مشمولہ علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز، مرتبہ؛ نسیم قریشی، علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی، ۱۹۶۰ء، ص ۶۷، ۶۸
(۱۴) ڈاکٹر عقیلہ جاوید (مرتب)، اردو نثر کے اسالیب،ص ۵۷
(۱۵) آلِ احمد سرور، سرسید اور مغرب کے تہذیبی و مغربی اثرات ،ص ۷۰
(۱۶) مولوی عبدالحق (مرتب)، مطالعۂ سرسید احمد خاں،علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء، ص ۹
(۱۷) ڈاکٹر سید عابد حسین، سید کا خواب اور اس کی تعبیر، مشمولہ علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز، ص ۳۰
(۱۸) آلِ احمد سرور، سرسید اور مغرب کے تہذیبی و مغربی اثرات ،ص ۷۳
(۱۹) ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب، سرسید خدمات اور اثرات، مشمولہ مقالاتِ سرسید صدی بیاد گارِ یومِ وفات صد سالہ سرسید احمد خان، (۱۹/ مارچ ۱۹۹۹ء)، ص ۱۹
(۲۰) ڈاکٹر محمد صدیقی، سرسید احمد خاں اور جدت پسندی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۳ء، ص ۸
(۲۱) ڈاکٹر عقیلہ جاوید (مرتب)، اردو نثر کے اسالیب،ص ۶۳، ۶۴
(۲۲) ایضاً،ص ۲۸۶
(۲۳) پروفیسر خلیق احمد نظامی، سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے ،ص ۱۵۲
(۲۴) آل احمد سرور، سرسید اور مغرب کے تہذیبی و مغربی اثرات ،ص ۷۳
(۲۵) ڈاکٹر سید عبداللہ، سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء، ص ۴

مآخذ

(۱) ثاقب، شہاب الدین، ڈاکٹر، سرسید خدمات اور اثرات، مشمولہ مقالاتِ سرسید صدی بیاد گارِ یومِ وفات صد سالہ سرسید احمد خان، (۱۹/ مارچ ۱۹۹۹ء)
(۲) جاوید، عقیلہ، ڈاکٹر (مرتب)، اردو نثر کے اسالیب، (منتخب مضامین)، لاہور: بیکن ہاؤس، ۲۰۰۴ء
(۳) حسین، ثریا، سرسید احمد اور ان کا عہد، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۳ء
(۴) حسین، سید عابد، ڈاکٹر، سید کا خواب اور اس کی تعبیر، مشمولہ علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز، مرتبہ؛ نسیم قریشی، علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی، ۱۹۶۰ء
(۵) سراج الدین، منشی محمد (مرتب)، سرسید احمد خان کے لیکچروں کا مجموعہ مع مختصر سوانح عمری، لاہور: کشمیری بازار، ۱۸۹۰ء
(۶) سُرور، آلِ احمد، سرسید اور مغرب کے تہذیبی اثرات، مشمولہ علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز، مرتبہ؛ نسیم قریشی،

علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی، ۱۹۶۰ء
(۷) صدیقی، رشید احمد، پروفیسر، سرسید اور علی گڑھ، مشمولہ علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز، مرتبہ: نسیم قریشی، علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۶۰ء
(۸) صدیقی، محمد، ڈاکٹر، سرسید احمد خاں اور جدت پسندی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۳ء
(۹) عبدالحق، مولوی (مرتب)، مطالعۂ سرسید احمد خاں، علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء
(۱۰) عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء
(۱۱) نظامی، خلیق احمد، پروفیسر، سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے، نئی دہلی: انجمن ترقیِ اردو (ہند)، ۱۹۹۳ء
(۱۲) یوسف، جمیل، پاکستانی ادب کے معمار سر سید احمد خاں: شخصیت و فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۹ء

رسائل و اخبارات

(۱) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ، جلد ۱، شمارہ ۱، ۳۰/ مارچ ۱۸۶۶ء
(۲) ______، جلد ۸، شمارہ نمبر ۳۳، ۸/ اگست ۱۸۷۳ء